ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.3 2021

احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ

Ahmad Nadeem Qasmi and Urdu Fiction

۱۔ نثار علی
پی ایچ ڈی اسکالر شعبہ اردو سرحد یونی ورسٹی پشاور
۲۔ عائشہ بی بی
ایم فل اسکالر شعبہ اردو قرطبہ یونی ورسٹی پشاور
۳۔ شجاعت علی
ایم فل اسکالر شعبہ اردو سرحد یونی ورسٹی پشاور

ABSTRACT:
Nadeem Qasmi's name is distinguished among the fiction writers who, after Preem Chand, advanced the tradition of Urdu fiction and used it for serious artistic criticism of life and society. There is a glimpse of a serious purpose from the beginning. And his art is the product of a cultured and trained mind. There is a process of evolution in Nadeem's fictions. The themes of his fictions are diverse. There is diversity in the themes of his fiction. His fiction is not just a love story because the depiction of the feelings of love is always influenced by the fabric of social motives. The perfection of Nadeem was that he was a great fiction writer and a great poet at the same time. This is the charisma of creative literature that is rarely seen.
Key Words: *Ahmad Nadeem Qasmi,Urdu Fiction,Prem Chand, diversity, social motives*
کلیدی الفاظ: احمد ندیم قاسمی، اردو افسانہ، پریم چند، تنوع، سماجی مسائل

پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا، اور اسے سستے پروپیگنڈے کا آلہ کار نہ بناتے ہوئے زندگی اور سماج کی سنجیدہ فنی تنقید کے لیے استعمال کیا، ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ عبد الحفیظ ظفر اپنے مضمون "احمد ندیم قاسمی ایک کثیر الجہات ادبی شخصیت" میں لکھتے ہیں:

> "جہاں تک احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو اس کے بارے
> میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پریم چند کے بعد دیہی زندگی کی جس خوب صورت
> طریقے سے انہوں نے عکاسی کی ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے"(۱)

اپنے اسی مضمون میں ایک اور جگہ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> "ندیم کے افسانوں میں ہمیں سماجی اور معاشی ناہمواریوں کے حوالے بہت کچھ پڑھنے
> کو ملتا ہے۔ ترقی پسندانہ سوچ کی تمام پرچھائیاں ان کے افسانوں میں ڈھونڈی
> جاسکتی ہے"(۲)

اردو افسانے نے بتدریج نہیں بلکہ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ترقی کی بہت سی منزلیں ایک ہی جست میں طے کی ہیں اور اس کے نشو و ارتقا میں غیر ملکی افسانوں کے ترجموں اور خود یہاں کی سرعت سے بدلتی ہوئی معاشی اور اجتماعی زندگی کے حالات نے خاصا حصہ لیا ہے۔ افسانے کا فن بڑا ریاض چاہتا ہے۔ اس میں ایک منفرد تجربہ مشاہدے کی ایک قاش، تاثر کی ایک تھرتھراتی شعاع ہی رقص کرتی ہے۔ لیکن یہ تجربہ، یہ مشاہدہ، یہ تاثر ایک جام جہاں نما ثابت ہوتا ہے جس کی تجسیم کے وسیلے سے حقیقت کے بے شمار گوشے سمٹ کر روشنی میں ابھر آتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ نگار زندگی کے خلفشار میں سے چند جاذب نقطوں کو چن کر علیحدہ کر لیتا ہے۔ اور پھر انہیں ایسی دل آویزی، شدت تاثیر اور قطعیت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان پر بڑی خارجی اور اندرونی حقیقتوں کا ادراک کر سکے۔ غالب کے الفاظ میں قطرے میں دجلہ کا نظارہ کرنا اور دوسروں کو کرانا، افسانہ نگار کے لیے ایک بنیادی فنی تقاضا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ ندیم قاسمی کے یہاں شروع ہی سے ایک سنجیدہ مقصد کی جھلک ملتی ہے اور ان کا فن ایک مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار ہے۔ ان کے ابتدائی اور بعد کے دور کے افسانوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے مقصد کا اظہار برملا ہوتا تھا، اب فن آداب کے پردوں میں چھپ کر سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے درجن سے زیادہ مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب افسانے ایک سطح اور معیار کے نہیں ہیں۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں لیکن ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں، جسے محض حسن نگارش کی کرشمہ سازی کہا جاسکے۔ یا تفریح طبع، لذتیت اور برہنگی کے جذبے کی نمائش کا نتیجہ کہہ کر اس پر خرد گیری کی جائے۔ کیونکہ ہر افسانے کی تعمیر کسی نہ کسی ایسے تجربے یا حادثے پر کی گئی ہے، جو انسانی روابط کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.3 2021

ڈھانچے کو بہت دیر تک اور دور تک متاثر کرتا ہے۔ طرقی پسند سے تحریک سے شدید وابستگی نے ان کے فطری تخلیقی ذہن کو جلا بخش ان کے ترقی پسندانہ سوچ کے حوالے سے قمر رئیس لکھتے ہیں۔

"ترقی پسند اور انقلابی دانشور 1948 اور 1949 میں جیلوں اور تہہ خانوں سے باہر آ کر یا
تو فن کار رہ گئے یا وہ بھی نہ رہے۔ ندیم ان چند ادیبوں میں سے جس کی طبقاتی
فکر اس آزمائش گزر کر کچھ اور روشن ہو گئی "(۳)

ان افسانوں میں سے بیشتر پنجاب کے دیہاتوں میں بسنے والوں کی زندگی کی مصوری کرتے ہیں۔ اس زندگی کے پیچھے برسوں کی روایات نظام معاشرت عقائد اور توہمات کا سہارا ہے اور افسانہ نگار اس فضا میں سانس لینے والے کسانوں اور زمینداروں، ان کے بیوی، بچوں ان کے کھیت اور کھلیان، ان کی چوپال، ان کے کنوؤں، چشموں اور جانوروں تک سے ایسی ہمدردی اور دلچسپی رکھتا ہے جو پریم چند کے علاوہ کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی۔ یہی افسانے کی کامیابی اور تاثیر کا راز بھی ہے۔ اس لیے کہ جس زندگی سے افسانہ نگار کی واقفیت صحیح اور براہ راست ہو اسے اگر خام مواد کے طور پر کام میں لایا جائے۔ اور تخلیقی قوت کو اس بنیاد پر عمل کا موقع دیا جائے۔ تو اس طرح حقیقت تخیل کی مطیع بھی رہے گی اور تابناکی بھی حاصل کرے گی۔ شاید افسانہ نگار نے یہ بھی محسوس کیا ہو کہ متوسط اور زیادہ تر نچلے طبقوں کی زندگی میں جو زمین سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ دیہات سے جذباتی لگاؤ کے حوالے سے خود لکھا ہے:

"مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ جب بھی میں اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے
ہوئے کھیتوں، امنڈتے ہوئے بادلوں۔۔۔۔ ایک دنیا میرے ذہن میں آباد
ہو جاتی ہے۔"(۴)

بنیادی انسانی محرکات کا مطالعہ جس بے ساختگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اتنا شاید ان لوگوں کے سلسلے میں ممکن نہ ہو، جن کی فطرت اصلی کو تہذیب کی چمک دمک ملوث کر دیتی ہے۔ شہری زندگی سے متعلق ندیم قاسمی کے افسانے کمزور ہیں۔ ان میں فنی ربط کی کمی ہے۔ کردار نگاری پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط نہیں اور ان میں وہ رچاؤ ہے۔ جو مشاہدے اور نقطہ نظر میں نکھار اور تیکھا پن پیدا کرتا ہے۔ "ہذا من فضل ربی"، "بھرم" اور "بندگی بے چارگی" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانوں میں ایک عمل ارتقا ملتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شروع کے افسانوں میں وہ چیزوں کو جیسا دیکھتے ہیں، ان کی کم و بیش ویسی ہی عکاسی کر دیتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ ان کے محرکات کا پتہ لگائیں اور انھیں بے نقاب کریں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ محض صورت حال میں افسانہ نگار کی دلچسپی کچھ عرصہ بعد کرداروں میں دلچسپی کا روپ دھار لیتی ہے۔ پھر یہ آخری دلچسپی بھی اعمال کے مطالعے سے تجاوز کر کے داخلی کیفیتوں کے تجزیے میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح انسانوں، اداروں اور مروجہ اور جکڑے ہوئے نسلی اور طبقاتی میلانات کے خلاف احتجاج، جھلاہٹ اور کبیدگی ایک ایسے خاموش اور موثر طنز میں بدل جاتی ہیں، جس کی نوک تیز اور جس کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ ندیم قاسمی کے افسانوں میں متانت، میان روی دلسوزی اور سمت و رفتار کا توازن ہمیشہ نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ ان سب کی تہہ میں انسان دوستی کا وہ جذبہ ہے، جو انھیں گرد و پیش کی اٹل حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرنے دیتا۔ انسان اپنے عقائد، تعصبات اور برتاؤ میں جیسا کچھ ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ لیکن یہ خواہش بھی افسانہ نگار کا دامن نہیں چھوڑتی کہ وہ ان بندشوں سے اونچا اٹھ کر ان امکانات کو آزمائے اور پورا کرے جو اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ پروفیسر روبینہ شاہین اس حوالے لکھتی ہیں:

"ندیم کے افسانوں کے کردار اور سیرتیں ہمارے ارد گرد کی پیداوار ہیں۔ وہ امکانی
اور فطری سطح پر ہمارے لیے مانوس ہیں"(۵)

ان کے افسانوں کے موضوعات وہ معاشی ناہمواریاں ہیں، جو ہماری زندگی میں قدم قدم پر موجود ہیں۔ ان کی وجہ سے ظلم و انتقام کی بے شمار شکلیں بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، اور سیاست اور مذہب کے ٹھیکہ دار ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر انھیں ہوا دیتے رہتے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریاں ہیں، جن کا نشانہ وہ ضرورت مند بنتے ہیں، جو اپنی مادی خصوصیات سے مجبور ہو کر بخوشی حکومت کے مقاصد کی براری کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ یہ انتقام اور رقابت کی وہ آگ ہے جو قبائلی انسان کے کردار میں اتنی نمایاں تھی اور اسے معمول سے عذر پر انسانوں کو خاک و خون میں ملا دینے پر اکساتی رہتی تھی۔ یہ آگ آج بھی دیہاتوں میں رہ رہ کر بھڑک اٹھتی ہے جو نہ انسان کو ایک مرکز پر ٹھہرنے دیتی ہیں اور نہ کسی ایک وسیع شاہراہ پر چاہے وہ اخلاق کی ہو یا مذہب کی یا انسانیت کی سوز و ساز کی، گام زن ہونے دیتی ہیں۔ عشق و محبت کا موضوع انسان کی زندگی میں اپنی مرکزیت کی وجہ سے ہمیشہ موجود رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ لیکن ندیم قاسمی کا افسانہ محض عشقیہ افسانہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ کیونکہ عشق و محبت کے جذبات کی عکاسی ان کے یہاں ہمیشہ سماجی محرکات کے تانے بانے سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں نہ اس رومانیت کے لیے کوئی گنجایش ہے جو خواہشات کو بے لگام چھوڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور نہ اس لذتیت کے لیے جو ذہنی اور اخلاقی عدم توازن تک لے جائے۔ ان کے یہاں صرف محبت کا رومان ہی نہیں، اس کی محرومیاں اور مجبوریاں بھی ہیں۔ اس لیے شاید یہ کہنا مناسب ہو کہ ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسان کی جنسی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.3 2021

اور حسیاتی زندگی محض حیاتیاتی سطح پر نہیں، بلکہ ایک وسیع حلقے کے اندر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ جہاں زندگی کے دوسرے مطالبات اور ذمہ داریاں بھی ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں جذبات واحساسات کی دھوپ چھاؤں بہت سے متنوع عناصر کے پس منظر ہی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ الغرض ندیم افسانوی فن نے کئی ارتقائی مدارج طے کیے ہیں۔ پروفیسر روبینہ شاہین اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"ندیم قاسمی نے افسانوی فن کے کئی ارتقائی مدارج طے کیے اس لیے وہ ناقدین جو
پہلے ان کے فن کو قابل قدر نہ سمجھتے تھے اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان کی فنی
عظمت کو تسلیم کیا جائے"(۶)

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ندیم قاسمی کے یہاں افسانوں میں متضاد رنگ بھی بنتے ہیں، اوران کی تخلیق ایک علمی ارتقا سے بھی گزری ہے۔ وہ کسی مخصوص فارمولے کو اپنا کر کسی نظریے کا پرچار کرنے کی خاطر افسانہ نہیں لکھتے لیکن زندگی میں چاروں طرف جو ظلم اور ناانصافی، جو پریشانیاں اور محرومیاں بکھری ہوئی ہیں اور فطرت انسانی کے پر پیچ وخم ان کے تجربے کی زد میں آتے ہیں، وہ انھیں تخلیق پر اکساتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "میرا دیس" کو لیجئے۔ اس میں اس حقیقت کی کسی حد تک براہ راست ترجمانی ہے کہ غربت اور طبقاتی ناہمواری کی وجہ سے کس طرح زبر دست زیر دست پر غالب رہتا ہے، اور اسے اپنی کام جوئی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور افسانہ ہے۔ "جب بادل امڈے" اس افسانہ کا ماحول بھی دیہات کا ماحول ہے۔ اور یہ ایک مہاجر کی داستان سے جو اپنا سب کچھ کھو کر اپنے وطن کو خیر باد کہتا ہے لیکن نئے وطن کا زمیندار بھی بہر صورت زمیندار ہی ہے۔ وہ اپنی سرشت کو بدل نہیں سکتا۔ مزارعے اس کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں حریف ناتواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی پوری قوت جمع کر کے راحت کی کوشش بھی کرے تب بھی انھیں ناکام اور ذولت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں دیہات کے اس قسم کی امکانات کے حوالے سے پروفیسر روبینہ ل مزید کہتی ہیں:

"ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہات کے پیش کش پریم چند سے کئی زیادہ
لطیف، رومان پرور اور دل کش ہے"(۷)

یہاں ایک اورافسانے کا ذکر ناموزوں نہ ہو گا۔ اس کا عنوان ہے "کنجری"۔ غربت کے اثرات سے زیادہ اس افسانے میں اس عمل کو واضح کیا گیا ہے جس کے زریعے روح پر کثافت کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی اصلی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ سرور اور اس کی ماں عرصہ سے جنس فروشی کا کاروبار چلاتے رہتے ہیں، اور اس میں اتنے ڈوب چکے ہیں کہ ان کی معمولی سی قوت امتیاز بھی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ مجموعہ "سناٹا" میں رئیس خانہ ایک معرکے کا افسانہ ہے۔ غربت کے زیر اثر انسانی بے بسی کی ایک دل سوز تصویر ہے۔ جسے انتہائی ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں "رئیس خانے کے مادی او طبعی وجود کو دل کش پس منظر اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی روشنی میں ابھارا گیا ہے۔ اس میں پہاڑی میاں بیوی، یعنی فضلو اور مریاں کی محبت کی سادگی، سرشاری سپردگی کی تصویر بھی ہے، اور یوسف جیسے رئیسوں کے فریب اور ریاکاری کا عکس بھی ہیں۔ افسانے میں تحیر کا عنصر بھی ہے، کیونکہ آخر وقت تک ہے قیاس کرنا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا کہ یوسف مریاں کو اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے یہ جذبات اور احساسات کی وہ کشمکش ہے، جس میں فضلو برا بر ہچکولے کھاتا رہتا ہے، حق و صداقت اور گناہ کی ترغیب کے درمیان جو آویزش اس کے دل میں پیدا ہو کر مختلف مرحلوں سے گزرتی ہے، اور جس طرح فضلو اور مریاں کی ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ (جو کہانی کے آخر میں شکست وریخت کے باوجود خود کر آتا ہے) یوسف کی عیاری اور جنسی بھوک سے مات کھا جاتا ہے سے حیرت انگیز فن کاری کے ساتھ ابھارا گیا ہے۔ افسانے پر بہترین اور آخری فیصلہ خود فضلو ہی کر دیتا ہے۔ پروفیسر روبینہ شاہین اسی فن کاری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم اور فعال رکن تھے۔
اس کے باوجود اپنے فن کو ہنگامی حالات اور تقاضوں کا شکار نہیں ہونے دیا۔
اس طرح ان کا فن فطری اور تازگی کے ساتھ سامنے آسکا"(۸)

اسی طرح افسانہ "ثواب"، "گھر سے گھر تک"، "الحمدللہ" اور "سناٹا" میں بڑا فرق ہے۔
"ثواب" میں فضا آفرینی قابل توجہ ہے۔ جھیور کے کنوئیں میں ڈوب جانے کی وجہ سے پورا گاؤں غمگینی کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ فضا بوجھل اور اداس سی لگ رہی ہے۔ گاؤں کے سب رہنے والے کرماں کی مصیبت میں برابر کے شریک اور اس کے لیے ہر جتن کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر اگر ایک طرف کرماں کے دل میں امید وبیم کی متضاد کیفیات کی مصوری کی گئی ہے تو دوسری طرف ہماری نظر میں اس بے حسی اور لاتعلقی کو بھی دیکھ لیتی ہیں۔ جو محض مذہب کے خول سے چمٹے رہنے والوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کی انسانیت کو جلا دینے کی بجائے انھیں محض مشین کا ایک پرزہ بنا دیتی ہے۔ ملک رحمن خان ایسے ہی ایک انسان کا مرقع ہیں۔ "الحمد اللہ" میں مولوی ابوالبرکات اپنی بنیادی انسانی ضروریات پورا کرنے کے لیے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.3 2021

چودھری نے فتح داداخان کے لطف و کرم پر تکیہ کرتے ہیں۔ اور ان گھی لگے وظیفوں پر جو ان کے متعقدین ان کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں ان کی ایک بیٹی مہرالنساء کی شادی انہی سہاروں کی بدولت بخیر وخوبی انجام پاتی ہے لیکن اب انھیں دوسری بیٹیوں کی شادی کی فکر کھانے لگتی ہے۔ رہنے سہنے کے پرانے طور طریقوں اور سوچنے اور عمل کرنے کے انداز میں تبدیلی آگئی ہے۔ جس کا اثر مولوی ابل کی کسب معاش پر بھی پڑا ہے۔ اس دوران تک مہرالنساء کے یہاں سے ولادت کی خبر آتی ہے اور مولوی ابل اور ان کی بیوی جی مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ آخر بیٹی کے ہاں خالی ہاتھوں کیسے جائیں۔ فتح داد خاں اپنی علالت کے زمانے میں بھی مولوی ابل کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے ہیں۔ جب آخری بار مولوی ابل چودھری صاحب کی مزاج پرسی کے لیے جانے کا ارادہ کرتے ہیں، اوران کے مرنے کی اطلاع نہیں ملتی ہے۔ تو اس خیال سے اچھل پڑتے ہیں کہ ان کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں جو کچھ ہاتھ آئے گا اس سے چشم زدن میں بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ ملاحظہ ہو۔

"اور مولوی ابل اس بجھتے ہوئے لہجہ میں چلا یا مبارک ہو عارف کی ماں !
تم نوا سے کے چولے کے لیے رورہی تھیں ۔ اللہ جل شانہ نے چولے ، چینی
اور ٹوپی تک کا انتظام فرمادیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے "(۹)

سچے مذہبی آدمی ہونے کے باوجود مولوی ابل آخر پیٹ کے تقاضوں کو کہاں لے جائیں۔ مذہب کے ذریعے تزکیہ نفس ممکن بھی ہے اور ہوتا بھی رہتا ہے۔ لیکن اس سے مادی ضروریات کی تکذیب کیسے کی جاسکتی ہے لیکن اس کے فوراہی بعد ایک دوسرا ڈرامائی موڑ آتا ہے جو عبرت ناک بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ یوں۔

"اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا۔ اس کی اوپر اٹھی
ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے
بعد مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلاف شرع
قرار دیتا تھا، چلا چلا کر رونے لگا۔ اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے
دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا"(۱۰)

"ثواب" کے مقابلہ میں یہ افسانہ یقیناً زیادہ گٹھا ہوا اور زیادہ پختہ ہے۔

جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے سلسلے میں ندیم قاسمی نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ علاوہ اس کشت وخون اور مالی نقصان کے جو جنگ اپنے ساتھ لاتی ہے، اس کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ فوجی بھرتی پر جو چیز نوجوانوں کو آمادہ کرتی ہے وہ غربت اور افلاس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ اور پھر گر سپاہی میدان جنگ میں ہلاک ہو جائیں تو ان کے وارثوں کو پنشن بھی ملتی ہے۔ اور یوں بے کسی کے مارے یہ نوجوان خوشی خوشی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو تباہی اور موت کے غار میں جھونک دیتے ہیں۔ "سپاہی بیٹا"(درودیوار) اور "بابا نور"(بازار حیات) اس سلسلے میں دو قابل توجہ مطالعے ہیں۔ دونوں انتہائی سادہ ہیں..... لیکن ان دونوں میں جو بات مشترک ہے یہ نفسیاتی گرہیں ہیں، جو جنگ سے متاثر ہونے کی وجہ سے سپاہی کی بوڑھی ماں بابا نور اندر کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی فطرت انسانی کے بہت اچھے نبض شناس ہیں۔ انسان اپنے آپ کو جس جس انداز سے دھوکے دیتا اور اپنے لیے جھوٹے سہاروں میں تسکین کا پہلو تلاش کر لیتا ہے، اس کی بہت اچھی نشاندہی ان کے افسانوں میں ہمیں ملتی ہے۔ "گھر سے گھر تک" اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ یہ افسانہ بہ ظاہر مزاحیہ لیکن دراصل عبرت ناک ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی اصلی حالت کو چھپا کر دوسروں کی نظروں میں عزت اور اعتبار حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ اور دوسروں کو کس کس انداز سے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ "فالتو "(مجموعہ: گھر سے گھر تک) میں وہ کشمکش نمایاں کی گئی ہے جو جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہمیشہ رہی ہے۔ جوانی میں جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں۔ بڑھاپا اور تنگ دستی اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو انھیں شہاب کی سرمستیوں کے سامنے پسپا ہونا پڑتا ہے۔ پیر بخش اور اس کی بیوی اور حبیب احمد اور خاتون کے تعلقات کا تانا بانا اسی راز کو فاش کرتا ہے۔ اس افسانے میں بہت سے نازک موڑ آتے ہیں:

"پیر بخش کو ایسا لگا کہ اس نے گھر کے باغیچے کے سارے پھول نوچ کر پھینک
دیئے ہیں اور ہر طرف پودوں کے ننگے خنجر اگے ہوئے ہیں۔ سناٹے کو توڑنے کے
لیے وہ اپنی چارپائی کو گھسیٹتا اس گوشے میں لے آیا، جہاں حبیب احمد کی شادی
کے بعد نیر ک بخت اور اس کے کھٹولے رہتے تھے۔ اور جہاں فاتحہ خوانوں
کے لیے چھٹائی بچھی تھی"۔(۱۱)

ازدواجی زندگی کی وہ ناہمواریاں جو عمر کے تفاوت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ "بیٹے بیٹیاں" (برگ حنا) میں دکھائی گئی ہیں۔ یہاں جذبات کا مدوجزر خارجی حالات کے پیچ و خم سے منسلک ہے۔ اور جوانی کی فطری احساسات کمزور اور عارضی امکانات اور پیش بندیوں کو توڑ کر جس طرح امنڈ پڑتے ہیں۔ انھیں بہت ضبط اور سلیقے کے ساتھ ہے برتا گیا ہے۔ اس افسانے میں عمل اور کردار دونوں ایک مبہم فضا کے اسیر ہیں، افسانہ بہت آہستگی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور بہت سی باتوں کے سلسلے میں محض سرگوشی کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

تقسیم سے متعلق فسادات پر اردو میں کئی اچھے افسانے لکھے گئے۔ مثلا بیدی کا "لاجونتی"، احمد عباس کا "سردارجی" اور پریم ناتھ درکا "اخ تھو " اس موضوع پر ندیم قاسمی کے دو افسانے قابل ذکر ہیں یعنی "میں انسان ہوں" (درودیوار) اور "پرمیشر سنگھ (بازار حیات) "اخ تھو" اور میں انسان ہوں "میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اول الذکر میں زہرنا کی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ "میں انسان ہوں" زیادہ توازن اور سجل لیکن تاثیر میں کم نہیں ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ پانی کے ایک گھونٹ کو رمز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس ازلی اورابدی تڑپ کی نشان دہی کرتا ہے، جو انسان کے دل میں انسانیت کے بقا اور تحفظ کے لیے موجود ہے۔ لیکن فسادات میں جن کی وجہ سے انسانی شخصیت بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور تمام آدرشوں کے پرخچے اڑ گئے ہیں پانی کے اس گھونٹ کو وقتی طور پر انسان کے لیے ناممکن الحصول بنادیا ہے۔ پرمیشر سنگھ کو درجہ اول کی تخلیق ماننا مبالغہ نہ ہوگا۔ اول الذکر افسانے یعنی "میں انسان ہوں" میں عمومیت ہے۔ یا یہ کہیے کہ "میں انسان ہوں" میں صرف محشر جذبات ہے "پرمیشر سنگھ" میں تاثرات واضح کرداروں اور صورت حال کی شکل میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں۔ اسی طرح "سردارجی" میں تصویر سچی ہونے کے باوجود قدر غیر متناسب ہوگئی ہے۔ ندیم قاسمی کے یہاں ہر چیز جچی تلی اور نوک پلک سے درست ہے۔ "پرمیشر سنگھ" ان سب سکھوں اور مسلمانوں سے الگ ہے، جن کے سروں پر بہیمت کے بھوت ناچ رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اس میں ایک سوز اور دردمندی ہے۔ اس کا اپنا لڑکا کرتار اسنگھ بھی اغوا کیا جاچکا ہے۔ اس لیے اس کا دل اتنا حساس ہو گیا ہے اپنی بیوی اور بیٹی امر کور کے برعکس وہ چھوٹے سے بچے اختر سے جو اسے فسادات کے دوران مسلمانوں کے قافلے سے بچھڑ جانے کی وجہ سے مل گیا ہے۔ انتہائی محبت اور لاڈو پیار کا برتاو کرتا ہے۔

ندیم قاسمی کے افسانے فنی اعتبار سے بہت گھٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں کے بعض جملوں میں تکرار پائی جاتی ہے۔ مثلاً "میں انسان ہوں" میں یہ جملے کئی بار آئے ہیں:

"یہ پیاس ہی میری تلاش ہے، اور زندگی ہے اور آخرت ہے۔

اور میں اس وقت بھی پیاسا ہوں" (۱۲)

ایک اور جگہ یوں لکھتے ہیں۔

"اور کیچڑ نے خشک ہو کر میرے ہونٹوں کو کمان کی زہ کی طرح تان رکھا ہے

چمکتے ہوئے سبز رنگ کی ایک مکھی بار بار میرے حلق تک گھوم آتی ہے۔

اسے نمی کی تلاش ہے، اور میں ایک پیاسا انسان ہوں اور مکئی کے پودوں کی

جڑیں گن رہا ہوں" (۱۳)

احمد ندیم قاسمی کے بیشتر افسانوں کا اختتام قابل غور ہے۔ اس میں ایک ڈرامائی عنصر کی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کہانی کے آخر میں ہمیں عمل کے عواقب کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ اس سے افسانے میں لازمی طور پر ایک سپاٹ پن پیدا ہو جائے گا۔ افسانے کا فن، ناول کے فن کی نسبت زیادہ حسین تناسب اور قطع و برید چاہتا ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں "تاثر اور تجربے کا بھرپور تشبیہ بخش اظہار تمام ہو جائے۔ یا اس کی گنجائشیں امکانی طور پر کام میں لائی جاچکیں وہیں افسانہ ختم ہو جائے۔ افسانے کے دوران میں جو نقطہ ہائے انحراف پائے جاتے ہیں، وہ سب مل کر ہمیں ایک انجام تک لے جاتے ہیں۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد اگر افسانے کو غیر فطری طور پر طول دیا جائے گا نہ تو اس سے وحدت تاثر اور فارم کی موزونیت دونوں کو صدمہ پہنچے گا۔ بعض اوقات افسانہ نگار وقت کے بہت سے نقطوں کو پھلانگ کر انتہاء تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں پڑھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اس انتہا کا رشتہ کہانی کے آغاز سے جوڑے اور اس حرکت اور تموج کو گرفت میں لانے کی کوشش کرے جو انسان کے ڈھانچے میں موجود ہے۔ "گونج" (طلوع و غروب) "پرمیشر سنگھ"، "ہیرا" (ربازار حیات) "ماتم" - "نصیب" (برگ حنا) "سلطان" (گھر سے گھر تک) "الحمدللہ"، "گنڈاسا" اور "چور" (سناٹا) کے ڈرامائی اختتام قابل غور ہیں۔ پروفیسر روبینہ شاہین اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"احمد ندیم قاسمی ایک شاعر کا دل و دماغ رکھتے ہیں، چنانچہ ایسے مواقع

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.3 2021

پر ان کا اسلوب انتہائی وابستگی کے ساتھ اپنا جوہر دکھاتا ہے"(۱۴)

احمد ندیم قاسمی ایک خوش گو شاعر بھی ہیں اور یہ شاعرانہ انداز افسانوں میں جگہ جگہ ہمیں ملتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ دلکش تشبیہات استعمال کرتا ہے یا پورے ایک پراگراف میں فطرت کی نقاشی کرتا ہے۔ لیکن یہ نقاش فن برائے فن کی حیثیت سے افسانوں میں جگہ نہیں پاتی۔ ندیم قاسمی کی تحریر اس وقت چمک اٹھتی ہے۔ جب وہ جذبات کی کشمکش کو نمایاں کرنے یا معتدل بنانے کے لیے فطرت کی طرفگی اور شادابی کا سہارا لیتے ہیں اور اس کے بے داغ حسن پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کی مٹی، ہوائیں، سبزہ زار ٹیلے اور چشمے، چراگاہیں اور ریگستان، ان سب کی بو باس قدم قدم پر اپنی جانب کھینچتی ہے۔ فطرت انسان کے فن سے تکملہ بھی کرتی ہے اور انسانی جذبات کو فطرت کے آئینے میں ایک نکھار بھی ملتا ہے ۔

"تھالیوں کی طرح بجتی رہیں۔ یوسف بھاگ کر صحن میں آگیا"(۱۵)

ایک اور جگہ یوں لکھتے ہیں۔

" پھر جب میں چونکا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ دور تک پھیلے ہوئے

سرسوں کے کھیتوں پر اونگھ رہی تھی"(۱۶)

اور یہ بھی کہ۔

"اتنے علی الصبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے

میں نے صبح کو عریانی کے عالم میں اس کے خلوت کدھے میں دیکھ

لیا ہے"(۱۷)

قاسمی اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور انسان کے پیچ و خم ان کی واقفیت بڑی دورس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگین پردہ نہیں ڈالتے اور انسانی عنصری محرکات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے نہیں جھجکتے ۔ ندیم اتنے بڑے انسان، اتنے بڑے شاعر، اتنے بڑے افسانہ نگار اور دانشور تھے کہ آج کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اردو ادب کے لیے ان کی وفات ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"احمد ندیم قاسمی کا کمال یہ تھا کہ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی بڑے
تھے اور شاعر بھی بڑے تھے۔ تخلیق ادب کا یہ ایسا کرشمہ کے بہت کم دیکھنے
میں آتا ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بھی بلند پایا تھا اور تخلیقی شعور بھی کمال درجے کا تھا"(۱۸)

قاسمی صاحب ان لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں جن کی تخلیق تنقیدی شعور پر مبنی ہے۔ اور جن کی تنقید تخلیقی عمل کا ثبوت دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱)، عبدالحفیظ ظفر احمد ندیم قاسمی ایک کثیر الجہات شخصیت، مشمولہ روزنامہ دنیا، 10 جولائی 2017، ص 6
۲) ایضاً، ص 6
۳) قمر رئیس، افسانہ نگار ندیم، مشمولہ افکار کراچی، ندیم نمبر، 1975، ص 366
۴) ایضاً، ص 92
۵) پروفیسر روبینہ شاہین، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی مختلف جہتیں، مشمولہ خیابان پشاور، بہار 2011، ص ۳
۶) ایضاً، ص 4
۷) ایضاً، ص 1
۸) ایضاً، ص 1

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.3 2021

۹)قمر رئیس اردو افسانہ، مشمولہ افکار، ندیم نمبر، 1945، ص314

۱۰)ایضاً، ص314

۱۱)ایضاً، ص315

۱۲)ایضاً، ص318

۱۳)ایضاً، ص318

۱۴)پروفیسر روبینہ شاہین، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی مختلف جہتیں، مشمولہ خیابان، بہار 2011، ص3

۱۵)مضمون، اردو افسانہ، مشمولہ افکار، ندیم نمبر، 1945، ص314

۱۶)ایضاً، ص319

۱۷)ایضاً، ص320

۱۸)ڈاکٹر جمیل جالبی، احمد ندیم قاسمی، مشمولہ ادبیات، کراچی احمد ندیم قاسمی نمبر، 2016، ص21